اُردو اور ہندی: وحدت/ثنویت (اِلتہاب سے اِلتیام تک)

محمد خاور نوازش*

ڈاکٹر انوار احمد**

ڈاکٹر قاضی عابد**

Abstract:

Urdu and Hindi reflect two different cultural preferences of their speakers. Cultural division between the Hindus and the Muslims started effecting one common language; that was Khari-Boli, particularly from the eighteenth century. In the nineteenth century, English colonizers, after observing these cultural preferences of the two major communities of India secured that division for their own political interests. This article deals with the historical background of the Urdu Hindi controversy and discusses the fact that divergence is based on several centurial socio-political history of Hindustan. Some earnest and conscientious activities intended to keep both the languages close to each other and the efforts made to conciliate the language contestation are also discussed in this research paper.

کھڑی بولی کی اُردو اور ہندی میں تقسیم کو اکثر انگریزوں کے تسلط کے ساتھ جوڑ دیا جاتا ہے اس لیے کہ نوآبادیوں میں ہمیشہ Divide & Rule کی پالیسی سامراجی طاقتوں کے سیاسی ایجنڈے کا حصہ محسوس ہوتی ہے لیکن یہ بات پوری طرح ٹھیک نہیں۔ سامراجی طاقتیں اپنے مفادات کا تحفظ مقامی باشندوں کو مذہبی، سیاسی، معاشرتی، علمی اور معاشی سطح پر طبقات میں تقسیم کیے رکھنے سے یقینی بناتی ہیں لیکن ہندوستان میں اگر غیر جانبداری سے

* پی ایچ ڈی سکالر، شعبہ اُردو، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان

** سابق پروفیسر شعبہ اُردو، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان

** شعبہ اُردو، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان

دیکھا جائے تو انگریزوں کی آمد سے پہلے ہی سماج مذہبی اور سیاسی سطح پر اس طرح منقسم تھا کہ انھیں مزید تقسیم کرنے کی ضرورت پیش نہ آئی۔ انگریزوں نے پہلے سے موجود تقسیم اور تفریق کو برقرار رکھتے ہوئے اپنے مفادات حاصل کیے۔ اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان میں پوری طرح قدم جمائے۔ چند استثنائی مثالیں چھوڑ کر اورنگ زیب عالمگیر کی پالیسیوں کو بحیثیتِ مجموعی کوئی بھی باشعور مورخ صلح یا اتحاد کی پالیساں قرار نہیں دے سکتا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے بیچ اورنگ زیب کے دور میں ایک ایسی فصیل کھڑی ہو چکی تھی جس نے مذہب کے علاوہ علم اور ثقافت کو بھی رخنوں میں بانٹنے کا آغاز کیا۔ اورنگ زیب کی وفات (۱۷۰۷ء) کے بعد ہندوستان میں خانہ جنگی کی کیفیت رہی اور ڈیڑھ سو سال کا عرصہ بغاوتوں اور نئی خود مختار ریاستوں کے قیام کا دور تھا۔ کچھ مورخین نے یہ بڑی غلط فہمی پھیلائی ہے کہ انگریزوں نے مسلمانوں سے اقتدار چھینا تھا اس لیے انھوں نے مسلمانوں کی ہمیشہ مخالفت کی اور ہندوؤں کو مذہبی، علمی اور ثقافتی سطح پر اُن کے مقابلے میں ابھارا۔ یہ بات حقائق کے بالکل منافی ہے۔ انگریزوں کو ہندوستان پر قابض ہونے کے لیے مسلمانوں سے کہیں زیادہ مرہٹوں کی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ اٹھارویں صدی عیسوی کے وسط میں مغل حکمرانوں اور مرہٹوں کے پیشوا بالا جی باجی راؤ کے بیچ جس معاہدہ پر دستخط ہوئے اُس کی رُو سے مغل صرف دہلی کے حاکم رہ گئے اور اُن کی قلمرو میں شامل باقی صوبہ جات مرہٹوں کے قبضے میں چلے گئے۔ اس فارسی مصرعے 'سلطنتِ شاہ عالم، از دلی تا پالم' کا تناظر یہی صورتحال تھی۔ بکسر کی لڑائی (۱۷۶۴ء) میں انگریزوں سے شکست کھانے کے بعد تو جیسے مغلوں پر بالکل ہی زوال آ گیا تھا۔ شاہ عالم ثانی کو انگریزوں سے معاہدے کے تحت دہلی میں بیٹھنے کی اجازت بھی نہ تھی تا آنکہ مرہٹوں نے اٹھارویں صدی کے آٹھویں عشرے میں دہلی پر قبضہ کر لیا اور اُن کی حفاظت میں شاہ عالم ثانی دہلی واپس آیا۔ مورخین اگر شاہ عالم ثانی کی کٹھ پتلی حیثیت کو بھی مغلوں کی طاقت سمجھ کر یہ لکھیں کہ انگریزوں نے دہلی مسلمانوں سے چھینا تو یہ تاریخ سے چشم پوشی شمار ہوگا۔ ۱۸۰۳ء میں انگریز جنرل لارڈ لیک نے مرہٹوں کو شکست دے کر دہلی فتح کیا نہ کہ مسلمانوں کو۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کو اگر جنگِ آزادی لکھا جائے تو یہ اپنی مٹی سے محبت یا غیر ملکی حکمرانوں سے نفرت کا سبب تو ہو سکتا ہے لیکن تاریخ اسے معروضی تناظر میں بغاوت ہی بتائے گی۔ انگریزوں کی فتحِ دہلی کے بعد شاہ عالم ثانی مرہٹوں کی غلامی سے نکل کر انگریزوں کی غلامی میں آ گیا اور پھر بہادر شاہ ظفر تک مغل صرف برائے نام ہی حاکم تھے۔ اس تفصیل کا مقصد یہ غلط فہمی رفع کرنا ہے کہ انگریز مسلمانوں سے اقتدار چھین کر ہندوستان کے مرکز تختِ دہلی پر براجمان ہوئے تھے۔ اس کی بجائے یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ مسلمان انگریزوں کو اپنا اصل مخالف سمجھتے تھے کیونکہ اُن کے لیے ہندو کبھی بھی بڑی قوت نہیں رہے۔ انھوں نے صدیوں ہندوؤں پر حکومت کی اس لیے ہندوؤں کو اپنا حریف سمجھنا اُنھیں اپنے شایانِ شان نہیں لگتا تھا۔ مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں کو جب جب انگریز سرکار نے نوازا تب تب اس کی تعبیر یہی کی گئی کہ انگریز بغضِ معاویہ میں حبِّ علی کا مظاہرہ کر رہے ہیں یا اُن کا مقصد ہندوؤں اور مسلمانوں کو آپس میں دست و گریباں

رکھ کر خود فائدہ اُٹھانا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انگریزوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی نفاق سے سیاسی سطح پر فائدہ بھی اُٹھایا لیکن یہ نفاق اُن کے ہندوستان پر قابض ہونے سے پہلے ہی موجود تھا۔ اورنگ زیب عالمگیر کی وفات سے لے کر بہادر شاہ ظفر تک ہندو اور مسلمان سیاسی اور تہذیبی سطح پر تقسیم ہو چکے تھے۔ لسانی سطح پر تقسیم کا سہرا فورٹ ولیم کالج کے سر نہیں ہے، زیادہ سے زیادہ فورٹ ولیم کالج کو اس بات کا ذمہ دار ٹھہرایا جا سکتا ہے کہ وہاں پر یہ تقسیم قدرے واضح ہو گئی۔ اصل سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اٹھارویں صدی عیسوی میں کھڑی بولی (اُردو) میں کون سا ایسا بگاڑ آ گیا تھا جو خانِ آرزو، مرزا مظہر جانِ جاناں یا حاتم کو محسوس ہوا کہ اس زبان کو اصلاح کی ضرورت ہے۔ دہلی کی فضیلت قائم رکھنے کے لیے اِن شعرا، علما اور دہلوی زعما نے 'دکنیت' کے ساتھ ساتھ بہت سے ایسے 'ہندی' الفاظ کا بھی بلی دان کر دیا جو ثقیل عربی اور فارسی الفاظ سے کہیں زیادہ لطیف اور عام فہم تھے۔ گویا ہندوستانیوں نے پوری طرح انگریزوں کے زیرِ اقتدار آنے سے پہلے ہی تہذیبی سطح پر اپنے آپ کو تقسیم کر لیا تھا۔ انگریز حاکم بنے تو ہندوؤں نے انھیں نئے آقاؤں کے طور پر جلد قبول کر لیا لیکن مسلمان اپنی انانیت کے سبب یہ نہ کر سکے۔ اس پس منظر میں ہندوؤں کا انگریزوں سے زیادہ مراعات پانا فطری امر ہے۔ لسانی سطح پر اگر وہ اپنی زبان کو اور رسم الخط کو اہمیت دلانے میں کامیاب ہوئے تو یہ اُن کے عصری شعور کا نتیجہ تھا۔ کھڑی بولی (ہندی) کی عمر یقیناً اُردو کے مقابلے میں کم تھی، ادبی سرمایہ اُردو کے مقابلے میں کم تھا، اسی طرح سرکاری زبان کے طور پر فارسی کی جگہ اُردو کو ہی دی گئی تھی، فارسی رسم الخط کو ہمیشہ زیادہ اہمیت حاصل رہی، فورٹ ولیم کالج میں ہندوستانی یعنی اُردو کا شعبہ قائم ہوا تھا نہ کہ اُس ہندی کا جس میں للولال کوی نے 'پریم ساگر' لکھی، انگریزوں نے جو رسم الخط اور زبان پہلے سیکھی وہ بھی اُردو تھی۔ اس سب کے باوجود اگر مسلمان دانشور یا مورخ یہ لکھیں کہ شمال مغربی صوبہ جات کے گورنر سر انٹونی میکڈونل نے مسلمانوں سے معاندانہ رویہ رکھتے ہوئے بنارس کے ہندوؤں کو نوازا تو یہ اُس غلطی کا جواز پیش کرنے کے مترادف ہوگا جس کے سبب انھوں نے اٹھارویں صدی میں اُردو کو عربی فارسی زدہ کر کے اپنی دانست میں اصلاحِ زبان کی یا بیسویں صدی میں مہاتما گاندھی کی 'ہندوستانی' کی تجویز پر کان نہ دھرے۔ اٹھارہ سو ستاون تک اُردو اور ہندی میں اگر واضح تفریق ہو چکی ہوتی تو کبھی بھی غالبؔ اپنی زبان کو ریختہ اور اُردوئے معلٰی کے ساتھ ساتھ 'ہندی' نہ لکھتے۔ دیانند سرسوتی نے سنسکرت آمیز ہندی کی حمایت کی تو ایک مخصوص سیاق میں اُن کا یہ عمل ٹھیک تھا۔ وہ ہندوازم کے احیا کی تحریک چلا رہے تھے نہ کہ کوئی ادیب، شاعر یا کوئی سیاستدان تھے۔ ایک دوسرے تناظر میں یہ راجہ رام موہن کی برہمو سماج تحریک کی توسیع تھی اور ان دونوں تحاریک کو انگریزوں کے 'آرین بالادستی کے نظریۂ' (Theory of Aryan Supremacy) سے وافر توانائی ملی جس کا منبع و مرکز بنگال اور ایشیاٹک سوسائٹی رہی۔ سرسید احمد خاں نے متحدہ قومیت کا خیال ترک کر کے صرف مسلمانوں کی ترقی پر توجہ مرکوز کی تو اُن کا یہ عمل بھی ایک مخصوص سیاق میں درست تھا۔ جب ہندو اپنی نئی ہندی کے پرچار اور فروغ کے لیے کھل کر میدان میں آ گئے اور ان میں سرسید احمد خاں

کے کئی روشن خیال ہندو دوست بھی تھے تو اُن کا یہ کہنا غلط نہ تھا کہ اب ہندوؤں اور مسلمانوں کا اکٹھا رہنا ممکن دکھائی نہیں دیتا۔ اصل میں زبان کے مسئلے کو اگر ہندوستان کے سیاسی اور تہذیبی پس منظر میں دیکھا جائے تو بہت سی باتیں ایسی مشکل نہیں تھیں جتنا اُن کو الجھا دیا گیا ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں نے جب اپنی اپنی تہذیبی پہچان کو قومی پہچان سمجھ لیا تھا تو زبان نے بھی لامحالہ اس چکی میں پسنا ہی تھا۔ لسانی تقسیم کے ذمہ دار جتنے ہندو تھے اتنے ہی خود مسلمان بھی تھے۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ ایک طرف ہندو اور مسلمان اپنی الگ قومی حیثیت منوانے کے لیے کوشاں ہوتے اور دوسری طرف زبان جو ثقافت کا ایک اہم جزو ہے، مشترک رکھتے۔ ایک زبان رسم الخط کی منطق کہیے' اس کے بولنے والوں کو قومیت کے دھارے میں شامل کرنے کے لیے سمجھئے یا پھر صرف ضد کی وجہ سے مان لیجئے، بہر کیف دو میں تقسیم ہوگئی۔ ایک لمحے کے لیے اگر مسلمان اپنے آپ کو انیسویں صدی عیسوی میں ہندوؤں کی جگہ پر تصور کر لیں تو انھیں یہ احساس بخوبی ہوسکتا ہے کہ ہندی کی تحریک گزشتہ ہزار سال سے مسلمانوں کے زیرِ تسلط رہنے والے ہندوؤں کا ایک فطری ردِ عمل تھا، بصورتِ دیگر یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ مسلمانوں کی اپنی نااہلیاں جس طرح اُن کے سیاسی زوال کا سبب بنی اسی طرح لسانی تفریق کا پیش خیمہ ثابت ہوئیں۔ مسلمان دانشور ہندی تحریک کو صدیوں کے ہند اسلامی کلچر پر ضرب کاری قرار دے کر زیادتی کرتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ ہند اسلامی کلچر کی خواہش، ضرورت اور فروغ مسلمان بادشاہوں کی سیاسی حکمتِ عملیوں سے جڑا ہوا ایک باب ہے۔ جب وہ بادشاہ ہی برائے نام رہ گئے اور وہ سیاسی نظام ہی زوال پذیر ہو چکا تھا جو اس کلچر کا داعی تھا تو ہندو یا مسلمان اس کو اپنے سینوں سے کیونکر لگائے رکھتے۔ دراصل ہندی زبان کی تحریک میں اُردو کے خلاف جو زہر افشانی کی گئی وہ اُردو کی مخالفت سے زیادہ جدید ہندی کے جواز کی کوشش سمجھی جانی چاہئے وگرنہ اُردو کو مسلمانی بھاشا یا ملیچھ بھاشا یا طوائفوں کی زبان کہنے والے بہت سے ہندوؤں کو بھی معلوم تھا کہ یہ خالصتاً ہندوستانی زبان ہے اور صرف مسلمانوں ہی نہیں بلکہ ہندوؤں کے اپنے گھروں میں بھی بولی جاتی تھی۔ نفرت انگیز لیبل چپکانے سے بھی اُردو کے مقام و مرتبے کو کوئی جھٹلا نہ سکا۔ ایسا کرنے والے اور اُن کے معتوب دونوں جانتے تھے کہ یہ ایک نعرہ ہے جس کا سیاق احیائے ہندومت کی تحریک ہے۔ اگر وہ مخالفت اُردو کی ہوتی تو پنڈت نہرو اسے اپنے گھر کی زبان نہ کہتے اور مہاتما گاندھی اس کی بول چال صورت کو 'ہندوستانی' کی تجویز کے ساتھ قبول نہ کرتے اور منشی پریم چند جن کی تخلیقات اُردو کا زیور سمجھی جاتی ہیں اور جو مذہبی رجعت پسندی اور سماجی اونچ نیچ کے خلاف لکھنے والے اپنے عہد کے سب سے بڑے ترقی پسند لکھک تھے، اُردو پر اپنا حق نہ جتاتے۔ اُردو ہندی جھگڑے کے تناظر میں اُن کا مندرجہ ذیل تجزیہ بہت اہم ہے:

> ''اگر مسلمان اُردو میں عربی اور فارسی لغت ٹھونس ٹھونس کر اسے اسلامی رنگ دینا چاہتا ہے تو ہندو بھی اس میں ہندی اور بھاشا کے الفاظ داخل کر کے اسے ہندو رنگ دینے کا متمنی ہوسکتا ہے۔ اُردو نہ مسلمانوں کی میراث ہے نہ ہندوؤں کی۔ اس کے لکھنے اور پڑھنے کا حق دونوں کو حاصل ہے۔ ہندوؤں کو اس پر حق اولیٰ ہے کیونکہ وہ ہندی کی

> شاخ ہے۔ ہندی آب و گِل سے اس کی تخلیق ہوئی ہے اور محض چند عربی اور فارسی الفاظ داخل کر دینے سے اس کی ہیئت نہیں تبدیل ہو سکتی...... ہندو اُردو پر استحقاق سے دست بردار نہیں ہو سکتا اور نہ وہ اسے اپنے ڈھنگ سے لکھنے ہی سے باز آ سکتا ہے۔ اسی طرح جیسے مسلمان اسے اپنے ڈھنگ پر لکھنے سے باز نہیں آتے...... بٹوارا اس طرح ہو سکتا ہے کہ مسلمان لکھیں مسلمان ناظرین کے لیے ہندو لکھے گا ہندو ناظرین کے لیے، مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ ہندو تصنیف و تالیف سے یک قلم کنارہ کش ہو جائیں اور مسلمانوں کی تصنیفات پڑھ کر تشفی کر لیں۔ وہ ثانوی درجے کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔''**(۱)**

یہ 'ثانوی درجے' کا معاملہ سیدھا تہذیبی بالادستی سے جڑ چکا تھا۔ ہندوؤں کا خیال تھا کہ اصل زبان ہندی ہے اور اُردو اُس کی ایک شاخ، ایک روپ یا ایک شیلی ہے جبکہ مسلمانوں کا خیال تھا کہ اصل زبان اُردو ہے جسے طویل عرصے تک ہندی، ہندوی یا ہندوستانی کہا جاتا رہا ہے اور ہندی تحریک چلانے والے جس 'ہندی' زبان کو اصل سمجھتے ہیں وہ فورٹ ولیم کالج میں گھڑی گئی۔ جدید ہندی کے سب سے بڑے مبلغ بھارتیندو ہریش چندر نے دسمبر ۱۸۷۳ء میں بنارس سے نکلنے والے اپنے اخبار 'کوی وچن سدھا' کے ایک مضمون "Hindi versus Urdu: Philologically Hindi and Urdu" میں لکھا تھا:

> ''ہندی اور اُردو میں فرق کیا ہے۔ ہم بلا جھجک جواب دیتے کہ زبانوں میں کچھ فرق نہیں ہے کیونکہ قواعد کے اشکال اور اصول دونوں کے ایک ہیں لیکن فرق اتنا ہی ہے کہ ہندی میں جس کے لیے ہندی لفظ نہیں ملتا وہاں سنسکرت لفظ کام میں آتے ہیں اور اُردو میں آسان ہندی لفظ ہونے پر بھی اور جہاں لفظ نہیں ملتے وہاں تو ضرور ہی عربی اور فارسی کے لفظ لکھے جاتے ہیں۔ یہی دونوں میں فرق ہے۔''**(۲)**

بابو ہریش چندر کے ساتھیوں میں سے بال کرشن بھٹ نے اپنے پرچے 'ہندی پردیپ' کے فروری ۱۸۸۵ء کے شمارے میں لکھا:

> ''یہ کون کہتا ہے کہ اُردو دوسری چیز ہے سچ پوچھو تو اُردو بھی اسی ہندی کی ایک بدلی ہوئی شکل ہے۔''**(۳)**

'بھارت متر' کے بانی مدیر بال مکند گپتا نے جو ہریش چندر جی کے ہی پیرو کاروں میں شمار ہوتے ہیں ایک جگہ لکھا:

> اس وقت ہندی کے دو روپ ہیں ایک اُردو دوسرا ہندی۔ دونوں میں صرف الفاظ کا ہی نہیں رسم الخط کا بھی بڑا بھاری فرق پڑا ہوا ہے۔ اگر یہ فرق نہ ہوتا تو دونوں روپ مل کر ایک ہو جاتے۔ اگر ابتدا سے فارسی رسم الخط کی جگہ دیوناگری رسم الخط رہتا تو یہ فرق ہی

نہ ہوتا۔اب بھی رسم الخط ایک ہونے سے فرق مٹ سکتا ہے لیکن ایسا ہونے کی امید کم ہے ۔ابھی دونوں رُوپ کچھ عرصے تک الگ الگ اپنی اپنی چمک دمک دکھانے کی کوشش کریں گے۔آگے وقت جو کروائے گا وہی ہوگا۔''(۴)

اِن تینوں آرا کی روشنی میں اُردو اور ہندی الگ زبانیں نہیں بلکہ دو الگ رُوپ ہیں اور یہ خیالات اُن لوگوں کے ہیں جو ہندی تحریک کے راہنما تھے۔مسئلہ صرف یہ ہے کہ اِن لوگوں اور بہت سے دوسرے ہندی لکھکوں کی نظر میں اُردو ہندی کا بدلہ ہوا رُوپ تھا جس میں عربی فارسی الفاظ کی تعداد زیادہ تھی اور جو فارسی خط میں لکھا جاتا تھا۔بال مکند گپتا تو بین السطور یہ بھی کہتے ہیں کہ اس ایک ہی زبان کے لیے اصل خط دیوناگری تھا اور اگر اس پر اتفاق ہو جائے تو زبان میں تفریق ختم ہو سکتی ہے لیکن انھیں بھی پتا تھا کہ ایسا ممکن دکھائی نہیں دیتا۔جس طرح مسلمانوں نے عربی فارسی الفاظ اور رسم الخط کو اپنی تہذیبی علامت سمجھ لیا تھا اسی طرح ہندوؤں نے بھی سنسکرت اور برج بھاشا کے ساتھ ناگری رسم الخط کو یہ حیثیت دے دی تھی۔مہاتما گاندھی نے جب مشترک زبان 'ہندوستانی' کی تجویز پیش کی اور کہا کہ یہ فارسی اور ناگری دونوں خطوط میں لکھی جائے گی تو اُردو والوں نے یہ تجویز اس ڈر سے بھی رَد کی کہ ہندوؤں کی اکثریت اور نسبتاً زیادہ سرکاری عہدے اُن کے پاس ہونے کی وجہ سے بالآخر ناگری خط غالب آجائے گا اور ہماری تہذیبی میراث یعنی فارسی خط ہندوستان میں ماضی کی داستان بن جائے گا۔دوسرا یہ کہ اُردو کا پورا ادبی سرمایہ فارسی خط میں تھا سو 'ہندوستانی' کی تجویز ماننے اور ناگری خط قبول کرنے کا مطلب اُس سرمایے سے دستبرداری ہوتا۔یہی معاملہ ہندی کا تھا بلکہ اُس سے زیادہ دیوناگری خط کا تھا کیونکہ ناتھ پنتھیوں کا ادب اور بھگتی تحریک کا ادب ماسوائے پریم مارگی فلسفے کے پرچارک ملا داؤد، قطبن اور ملک محمد جائسی کی تحریروں کے ناگری خط میں ملتا ہے۔خواہ اُن کی زبان ہندی نہ تھی بلکہ اودھی اور برج بھاشا تھی لیکن آج بھی ہندی ادب اُسے اپنا حصہ تسلیم کرتا ہے اور اُردو ادب کا کوئی مورخ اس سرمائے پر اُردو کا دعویٰ نہیں کرتا۔اس ساری بحث سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اُردو اور ہندی میں بلاشبہ ایک لسانیاتی وحدت تو موجود تھی لیکن یہ وحدت انیسویں اور بیسویں صدی عیسوی کی سیاسی اور تہذیبی کشمکش کی نذر ہو گئی۔متذکرہ حالات میں لسانی تفریق کا فروغ پانا فطری بھی تھا اور لازم بھی۔لیکن ان لوگوں کی نیت پر کوئی شک نہیں کیا جا سکتا جنھوں نے دونوں زبانوں کو اکٹھا رکھنے یا ان دونوں میں لسانی ہم آہنگی کے لیے پرخلوص کوششیں کیں۔

جن دنوں بنارس سے ہندی کو سرکاری اور عدالتی زبان بنانے کی تحریک چلی' سرسید احمد خاں وہیں مقیم تھے۔انھوں نے لسانی ہم آہنگی کے لیے جتنی بھی کوششیں کیں وہ اس ایک نکتے کے گرد گھومتی تھیں کہ ہندی اُردو سے الگ کوئی زبان نہیں بلکہ اُردو کا ہی دوسرا نام ہندی ہے' یہ فارسی اور دیوناگری دونوں رسوم الخط میں لکھی جاتی ہے اور اسی زبان کو عدالتوں میں رائج رہنا چاہیے۔سرسید احمد خاں ایک روشن خیال مفکر تھے۔وہ ہندوستانیوں کو صرف سیاسی محاذ پر ہی ایک ساتھ دیکھنے کے خواہاں نہیں تھے بلکہ لسانی سطح پر بھی اتحاد کے خواہاں رہے۔بنارس میں قیام کے دوران جب لسانی تفریق کا واویلا ہوا اور شمال مغربی صوبہ جات میں سرکاری زبان ہندی کے لیے تحریک تیز ہوئی تو

بقول حاؔلی وہ بہت دل برداشتہ ہوئے۔ ہندی اُردو جھگڑے کا آغاز ۱۸۶۷ء میں اُس وقت ہوا جب شمال مغربی صوبہ جات کی برٹش انڈین ایسوسی ایشن کی طرف سے وائسرئے ہند کو درخواست بھیجی گئی کہ مقامی طلبا کے لیے انگریزی کے علاوہ ورنیکلر (مقامی/عام بول چال کی زبان) میں تعلیم حاصل کرنے کا انتظام بھی ہونا چاہیے وہ چاہے کلکتہ یونیورسٹی میں کسی ایک ورنیکلر شعبہ کے قیام کے ذریعے ہو یا پھر الگ ورنیکلر یونیورسٹی قائم کرکے۔ حکومت نے اس کا بڑا حوصلہ افزا جواب دیا اور ایسوسی ایشن کی تدابیر اور سائنٹفک سوسائٹی کے کام کی تعریف کے ساتھ یہ مشورہ دیا کہ پہلے سائنٹفک سوسائٹی کچھ مزید انگریزی کتب کے دیسی زبانوں میں تراجم کرائے تاکہ طلبا کے لیے ورنیکلر لٹریچر کی دستیابی کا کوئی مسئلہ نہ ہو۔ اسی دوران چند ہندی اخبارات میں اس بات پر بحث شروع ہوگئی کہ ورنیکلر سے مراد اُردو اور ہندی دونوں ہیں۔ ہندو طلبا کے لیے ہندی زبان اور ناگری خط میں کتابیں ترجمہ کی جانی چاہئیں۔ یہی وہ سال ہے جب پہلی بار شمالی مغربی صوبہ جات کی عدالتوں میں اُردو کی جگہ ہندی اور فارسی کی جگہ ناگری خط رائج کرنے کا باضابطہ مطالبہ ہوا۔ اس کی دلیل یہ پیش کی گئی کہ یوپی جو فیصلہ کن عوامی قوت کا گڑھ ہے' کی اسّی فیصد آبادی ہندو ہے۔ یہ مطالبہ بنارس کے اونچے طبقے سے تعلق رکھنے والے ہندو صحافیوں اور دانشوروں کی طرف سے کیا گیا۔ زبان کے مسئلہ پر وہ آپس میں تقسیم تھے لیکن رسم الخط کے معاملے میں سب ناگری پر متفق تھے۔ راجہ شیو پرساد جنھیں اُردو والے اپنا اولین بڑا مخالف قرار دیتے ہیں آخری وقت تک عربی فارسی الفاظ کو ہندی سے خارج کرنا غلط سمجھتے تھے جبکہ دوسرے لوگوں کا خیال تھا کہ کسی بھی مسلمانی بھاشا کے الفاظ ہندی میں نہیں ہونے چاہئیں۔ راجہ شیو پرساد نے جب ورنیکلر لٹریچر کی دستیابی کے لیے انگریزی کتابیں ہندی میں ترجمہ کرنے کی بات کی تو اصل مقصد یہ تھا کہ کتابیں ناگری خط میں ہوں۔ اُن کی ہندی کی تعریف ہمیشہ سے صرف ناگری خط تھا اسی لیے ہندی کے اچاریہ رام شکلا ایسے کئی مورخین نے کہا کہ راجہ شیو پرساد ناگری خط میں دراصل اُردو کے حامی ہیں۔ لسانی مسئلہ پر اختلاف کے پیشِ نظر کسی نے ورنیکلر یونیورسٹی کے مطالبے والی درخواست کی پیروی نہ کی۔ یوں وہ مطالبہ پس منظر میں چلا گیا۔

سرسید احمد خاں کے بیشتر سوانح نگاروں نے یہ لکھا ہے کہ انھیں عدالتوں میں فارسی کی جگہ ناگری رائج کرنے کا مطالبہ بہت نامعقول لگا تھا اور اسی مطالبے نے اُن کے ہندو مسلم اتحاد کے نظریے کو ٹھیس پہنچائی۔ اس کے برعکس جب اُن کا نومبر ۱۸۶۸ء میں الٰہ آباد انسٹی ٹیوٹ کے سیکریٹری سرودا پرساد ساندول کے نام خط سامنے رکھا جائے تو پتا چلتا ہے کہ سرسید احمد خاں کے دل میں لسانی ہم آہنگی کا جذبہ ابھی تک قائم تھا۔ عبدالجمیل خان نے اپنی اہم کتاب "The Politics of Language, Urdu/Hindi: An Artificial Divide" میں اُس خط کا ایک حصہ نقل کیا ہے' ملاحظہ کریں:

> "In my opinion to call Hindi, a composite language written in Nagari script, the current language of U.P is mixing the two Issues; speaking and writing are two

different things. I think the language of court should be the same, which you call "Hindi", I like to call it Urdu. And to discuss the script, be it Roman, Persian, or Nagari for its use, is a sterile issue. If somebody can document definite advantages of replacing Persian script by Nagari and reassure that it can be done with no hardships, I will have no objection."(۵)

سرسید احمد خاں کے اس خط کے جواب میں سرودا جی نے ناگری رسم الخط کی خصوصیات پر تفصیل سے لکھا اور یوں دونوں زعما کے بیچ خط و کتابت میں زبان کے مسئلہ پر ایک بحث کا آغاز ہوا جسے سرسید علی گڑھ میگزین میں شائع بھی کرتے رہے۔اسی اثنا میں اس موضوع پر اور بہت سے علما نے بھی لکھنا شروع کر دیا۔سرسید کو احساس ہونے لگا تھا کہ اُن کے ہندو دوست زبان کے مسئلہ کو مذہبی اور سیاسی سطح پر لے رہے ہیں۔لسانی ہم آہنگی کے لیے سرسید کی مخلصانہ کوششوں کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوسکتا ہے کہ انھوں نے ناگری خط کے لیے بھی مشروط آمادگی ظاہر کر دی تھی۔انیسویں صدی کے رُبع آخر کے معروضی حالات نے سرسید ایسے مضبوط اعصاب اور پختہ ارادوں کے مالک شخص کو بہت جلد اس نتیجے پر پہنچنے کے لیے مجبور کر دیا کہ اب ہندوؤں اور مسلمانوں کا علمی اور سیاسی میدان میں اتحاد بہت مشکل ہوگا۔

بہت سی علمی شخصیات، ادیبوں اور دانشوروں میں زبان کے مسئلہ پر تند و تیز بیانات اور علمی دلائل کا تبادلہ ہوتا رہا۔اب یہ مسئلہ 'اولیت' اور 'ثانویت' کے درجے کی قبولیت کا بن چکا تھا۔سرسید احمد خاں اُردو کے مقدمے میں یقیناً لچک کا مظاہرہ کر سکتے تھے لیکن دہلویت اور لکھنویت کے دھارے بھی ساتھ ہی موجود تھے۔انھوں نے اپنے مضامین میں انگریزی الفاظ کا استعمال زیادہ کر دیا' فارسی قاعدے کو رَد کر کے ہندی قاعدے پر تصریفات کرنے لگے اور نثر لکھنے کے نیچرل اسٹائل پر زور دیا لیکن اپنی زبان کی حیثیت کو ثانوی تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ ہوئے۔ ہندوؤں کی طرف سے اکثر علما یہ تو مانتے تھے کہ عربی فارسی الفاظ کو زبردستی خارج کر کے سنسکرت کو داخل کرنا درست نہیں لیکن یہ تسلیم نہ تھا کہ اصل زبان اُردو ہے اور ہندی کا جدید رُوپ شعوری واردات ہے۔اس سطح پر ایک لمحے کے لیے یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ شاید سارا مسئلہ نام پر آ کر اٹک گیا تھا۔مسلمان اُردو نام اس لیے بہتر سمجھتے تھے کہ اُن کے نزدیک اُس دور کی ہندی سے مراد سنسکرت آمیز مصنوعی ہندی تھا اور ہندو یہ کہنے میں حق بجانب تھے کہ اُردو ایک مصنوعی یا نیا نام ہے اور اس کا مطلب عربی فارسی آمیز ایسی زبان ہے جو صرف فارسی خط میں لکھی جا سکتی ہے۔مولوی عبدالحق کے مندرجہ ذیل خیالات جو ۱۹۳۹ء میں آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن دہلی سے نشر ہونے والی ایک تقریر میں ظاہر ہوئے اس بات کا واضح اعلامیہ بن جاتے ہیں کہ مسئلہ لسانی محاذ پر ثانوی حیثیت قبول کرنے یا رَد کرنے کا بن چکا تھا' ملاحظہ کریں:

''جدید ہندی جس کی اشاعت کی آج کل کوشش کی جا رہی ہے' نئے زمانے کی پیداوار ہے۔ اس نے فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں جنم لیا۔ دراصل یہ اُردو کا بچہ ہے وہ اس طرح کہ عربی فارسی الفاظ نکال کر اُن کی جگہ سنسکرت لفظ بٹھا دیئے تھے۔''**(٦)**

ہندی تحریک والے تو اُسے 'ہندی' ہی مانتے تھے جسے مولوی صاحب اُردو کا بچہ کہتے ہیں۔ صرف اُردو والے اُسے 'جدید ہندی' یا مصنوعی کہتے تھے۔ اسی کشمکش میں زبان کے تحفظ اور فروغ کے لیے بہت سی انجمنیں قائم ہو گئیں۔ ہندی کو سرکاری زبان کا درجہ دلانے کے لیے ۱۸۹۳ء میں قائم ہونے والی ناگری پرچارنی سبھا نے بڑی زوردار تحریک چلائی جو کامیاب ہوئی اور ۱۹۰۰ء میں انگریز سرکار نے ہندی زبان اور ناگری رسم الخط شمال مغربی صوبہ جات کی عدالتوں اور دفتروں میں جاری کرنے کا حکم دے دیا۔ سرسید کے ساتھیوں میں سے نواب محسن الملک ایسے راہنماؤں نے اس حکم نامے پر عمل درآمد سے پہلے ہی لیفٹیننٹ گورنر شمال مغربی صوبہ جات سرانٹونی میکڈونل کے سامنے یہ کہتے ہوئے گھٹنے ٹیک دیے تھے کہ 'عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے'۔

شمال مغربی صوبہ جات اور اودھ کے لیفٹیننٹ گورنر سرانٹونی میکڈانل کے دستخطوں سے ۱۸/اپریل ۱۹۰۰ء کو آرڈر نمبر 585/III-3430-68 جاری ہوا جس میں عدالتوں اور دفتروں میں فارسی رسم الخط کے ساتھ ساتھ ناگری رسم الخط کو بھی جاری کرنے کا حکم دیا گیا۔ نواب محسن الملک نے اس حکم نامے کے اجرا کے بعد ۱۳/مئی ۱۹۰۰ء کو منعقدہ ردِعملی کانفرنس سے خطاب میں جو کچھ کہا اُس سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ اُس وقت حقیقی صورتحال کیا تھی۔ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''صاحبو! مجھے گورنمنٹ سے اس بات کی کچھ شکایت نہیں ہے کہ اوس نے اس اہم اور نازک مسئلہ کے ہر پہلو پر کافی غور نہیں کیا۔ بلکہ مجھے خود اپنی قوم سے اس بات کی شکایت ہے کہ اوس نے اپنے حقوق اور فوائد کی حفاظت کا کچھ انتظام نہیں کیا۔ بلکہ دوسرے فریق کی مستعدانہ اور قابلانہ کوشش کے مقابلے میں مجرمانہ غفلت کی۔ سب کو معلوم تھا کہ دوسرا فریق باقاعدہ اور منتظم طریقہ سے اس بات کی کوشش کر رہا ہے کہ اُردو کے بدلے ہندی زبان اور فارسی حروف کی جگہ ناگری حروف سرکاری دفتروں میں جاری ہوں۔ اونکے امیروں نے اس کام کے لیے روپیہ سے اور اونکے تعلیم یافتہ نوجوانوں نے زبان اور قلم سے مدد کی ......مگر مسلمانوں نے کچھ توجہ اس پر نہ کی۔ صرف ایک مقام پر کسی قدر کچھ کوشش کی گئی اور میموریل لکھنے کے لیے ارادہ کیا گیا۔ اور بعض تعلیم یافتہ مسلمانوں نے اپنا وقت اور دماغ بھی اس کام میں صرف کیا مگر نہ دولت مند مسلمانوں نے روپیہ سے ان کی مدد کی نہ مواد جمع کرنے کا اُن کو سامان ملا نہ اون سربرآوردہ مسلمانوں نے جو گورنمنٹ میں خاص قدر اور عزت رکھتے ہیں اونکی

کچھ حمایت واعانت کی اور اس لیے وہ کام ناتمام رہا۔ اور جیسی کہ مسلمانوں کی عادت ہے سب مسلمان خوابِ غفلت میں پڑے سوتے رہے اور آخر کار بعد گزر جانے دو برس کی مدت کے جب یہ ریزولیوشن جاری ہوا تو اس طرح ہیبت زدہ ہو کر چونک پڑے جس طرح کسی بے خبر جماعت پر ناگہانی گولہ آ گرتا ہو۔''(۷)

صرف تین ماہ بعد ۱۸ر اگست ۱۹۰۰ء کو لکھنو میں ایک اور جلسہ منعقد ہوا جس میں نواب محسن الملک کی تقریر لسانی محاذ پر اپنی شکست تسلیم کرنے کا واضح اعلامیہ محسوس ہوتی ہے۔ بظاہر یہ احتجاج ایک فیصلے پر نظر ثانی کے لیے تھا لیکن ساتھ ہی اربابِ اختیار کو یہ پیغام بھی دیا جا رہا تھا کہ ہم ان جلسوں کے ذریعے مرحومہ (اُردو) کی آخری رسومات ادا کر رہے ہیں۔ اقتباس دیکھیے:

''یہ امر از بس ضروری ہے کہ ہم اپنی زبان کو زندہ رکھنے کی مقدور بھر کوشش کر گزریں اور اگر خدانخواستہ مسلمانوں کا یہ عظیم الشان جلسہ یا اسی نوعیت کی آئندہ مساعی اسے زندہ رکھنے میں ناکام ہو جائیں تب بھی کم از کم ہمیں اس بات کا اطمینان تو ضرور نصیب ہوگا کہ ہم نے اپنی عزیز ترین زبان کی تجہیز و تکفین کی آخری رسومات مرحومہ کی عظمت اور وقار کے عین مطابق انجام دیں اور مقدور بھر آخر وقت تک دستوری ذرائع کے ساتھ اس کے دفاع کے لیے لڑتے رہے۔''(۸)

بیسویں صدی شروع ہوئی تو سرسید احمد خاں تو دارِ فانی سے کوچ کر چکے تھے لیکن اُن کا علی گڑھ کالج ہندوستان کے نوابین کی اولادوں کی خواب گاہ اور سرکاری کٹھ پتلیوں کی پیداواری مشینری کی حیثیت سے موجود تھا۔ اُردو کے لیے علی گڑھ میں اب صرف کھوکھلے نعرے باقی رہ گئے تھے یا پھر تعزیہ برداری۔ ایک لمحے کے لیے سوچا جائے تو یہ بات واقعی عجیب لگتی ہے کہ ایک وقت میں ہندو مسلم اتحاد کی بات ہوتی تھی اور دوسرے وقت میں علی گڑھ کے طلبا میں مسلمان اور ہندو کا فرق ٹوپیوں کے مختلف رنگوں سے برقرار رکھوایا جاتا رہا۔ اسی طرح علی گڑھ میں تو ہمیشہ انگریزی زبان سیکھنے پر زور دیا گیا لیکن بنارس میں سرسید ایک ورنیکلر یونیورسٹی کے قیام کی خواہش لیے بیٹھے تھے۔ پھر یہ بات بھی دلچسپ ہے کہ شمال مغربی صوبہ جات میں تو ہندی اور ناگری خط جاری کرنے کی خلاف احتجاج میں علی گڑھ والوں نے انگریز گورنر کو بھی ناراض کر دیا لیکن اس سے پہلے جب بہار اور بنگال میں ہندی اور ناگری خط رائج ہوا تو کسی کے منہ سے احتجاج کا ایک لفظ تک نہ نکلا۔ یہ تضادات علی گڑھ کی تاریخ پر سوالیہ نشانات ہیں۔ جب ہندی اور ناگری خط کو سرکاری حیثیت مل گئی تب بھی اس سے کوئی خاص سبق نہ سیکھا گیا۔ پریم چند کے ساتھ کئی ترقی پسند دانشور ہندی کی غیر مشروط حمایت میں اس لیے بھی نکلے کہ اُردو کے خیمے میں علامہ نیاز فتح پوری ایسے کئی رومانوی ادیب آ بیٹھے تھے جو اپنے تخیلی گھوڑوں کے پیروں کے نشان ثقیل عربی اور فارسی میں چھوڑتے ہوئے آگے نکلے جا رہے تھے۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے بہت بامعنی تجزیہ پیش کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ’’دراصل اہلِ اُردو کی یہ کوتاہ نظری رہی ہے کہ انھوں نے ابھرتی اور بڑھتی ہوئی ہندی کے مقام کو نہیں پہچانا اور اسی نسبت سے دبتی اور گھٹتی ہوئی اُردو کا مقام ایک لسانی اقلیت کے طور پر متعین کرنے سے اغماض کرتے رہے۔ فلموں اور مشاعروں کے حوالوں سے وہ اُردو کی برتری قائم رکھنے کی کوشش کرتے رہے اور اپنے تعلیمی اداروں میں اسے ایک علمی زبان بنانے سے غفلت برتتے رہے۔ مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی باک نہیں ہے کہ علی گڑھ نے سرسید سے لے کر تا حال اردو کے حق کو ادا نہیں کیا ہے۔ اس کے سربراہوں نے اردو کی لڑائی کالج کی چار دیواری کے باہر تو لڑی اپنے صحن میں نہیں۔‘‘(۹)

بیسویں صدی میں تنظیمی سطح پر اُردو کے تحفظ اور ترقی کے لیے انجمن ترقی اُردو نے سب سے زیادہ خدمات انجام دیں اور بابائے اُردو مولوی عبدالحق نے ہندوستان میں اُردو کا مقدمہ پوری تن دہی سے لڑا۔ ہندی (جدید ہندی) کے تحفظ اور ترقی کے لیے ایسی ہی خدمات ہندی ساہتیہ سمیلن کی ہیں۔ ان اداروں کے پلیٹ فارمز اُردو اور ہندی میں ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے بھی استعمال ہوئے۔ دونوں پلیٹ فارمز پر منعقد ہونے والے جلسوں میں جہاں اُردو اور ہندی والوں نے اپنی اپنی زبان کے ساتھ محبت کا مظاہرہ کیا وہاں ایک دور میں گاندھی جی کی ’ہندوستانی‘ کی تجویز پر اتفاق کا عندیہ بھی ملا۔ لیکن اُس صلح جُو تجویز کو بھی چند لوگوں کی طرف سے گاندھی جی کی بدنیتی پر محمول کر کے نیا پروپیگنڈا شروع کر دیا گیا۔

تاریخی تناظر میں دیکھا جائے تو اُردو ہندی لسانی تنازع کے ہندوستان کی سیاست پر متوقع اثرات کی طرف جس بڑی سیاسی شخصیت نے سب سے پہلے دھیان دیا وہ مہاتما گاندھی ہی تھے۔ بہت کم مورخین اور ناقدین ایسے ہیں جنھوں نے گاندھی جی کو جانبدار قرار دیتے ہوئے تنقید کا نشانہ بنایا ہو۔ ہندوستان میں تو جتنے لوگوں نے بھی متذکرہ موضوع پر لکھا کسی کے ہاں ایسی کوئی بات نہیں ملتی البتہ پاکستان کے ڈاکٹر فرمان فتح پوری اور چند دوسرے مورخین نے جن کی مجبوریاں اُردو دنیا بخوبی جانتی ہے‘ گاندھی جی کی کوششوں کو کہیں سیاسی حکمتِ عملی قرار دیا ہے تو کہیں ذرا سخت لہجہ اختیار کرتے ہوئے دکھاوا بھی کہا۔ بہرصورت کچھ باتیں تو حقائق ہوتے ہیں اور بقیہ کو سرحد کے دونوں اطراف کے معروضی حالات کے سیاق میں دیکھا جانا چاہیے۔ بیسویں صدی میں اُردو اور ہندی نے الگ الگ دھاروں پر باقاعدہ سفر کا آغاز کر دیا تھا لیکن اس صورتِ حال میں بھی مہاتما گاندھی نے ایک مشترک زبان کے لیے کانگرس کے پلیٹ فارم سے اور اپنی ذاتی حیثیت میں کافی کوششیں کیں۔ ہندوستان آزاد ہونے کے بعد بھی وہ اپنے نظریات پر قائم رہے اور جب ’ہندی‘ کو دیوناگری رسم الخط کے ساتھ آزاد ہندوستان کی راشٹریہ بھاشا بنانے کی تجویز آئی تو انھوں نے غیر مشروط مخالفت کی۔ ۲راگست ۱۹۴۷ء کے ’ہریجن‘ میں شائع ہونے والا گاندھی جی کا ایک بیان ملاحظہ کریں:

''ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قومی زبان کے متعلق یہ جھگڑا کھڑا ہو گیا ہے کہ قومی زبان کیا ہو۔ مجھ سے کہا گیا ہے کہ وہ ہندی ہوگی جو دیو ناگری حروف میں لکھی جائے ۔ میں تو کبھی بھی اس پر رضا مند نہیں ہوسکتا۔ میں دو دفعہ ہندی ساہتیہ سمیلن کا صدر رہ چکا ہوں ۔ میں ہندی یا اُردو کا دشمن نہیں ہوسکتا۔ لیکن میں یہ سمجھ چکا ہوں کہ عوام کی زبان اور ہندوستان کی قومی زبان وہی ہوسکتی ہے جو اردو ہندی کا مرکب ہو اور دیو ناگری اور اُردو دونوں رسم الخط میں لکھی جائے ۔''(۱۰)

اسی طرح ۱۸ر دسمبر ۱۹۴۷ء کا یہ تاریخی بیان ملاحظہ کیجیے:

''میں دو دفعہ ہندی ساہتیہ سمیلن کا صدر رہ چکا ہوں اُس وقت تو سمیلن قومی زبان کے متعلق میری کوششوں کا سواگت کرتی تھی مگر اب کیوں وہ اس بات کو ناپسند کرتی ہے ۔کیا اردو اور ہندی کو ملا کر ایک زبان بنانے کی کوشش کر کے میں کمتر درجے کا ہندو یا ہندستانی ہو گیا؟...... کیا وہ ایک کل ہندستان کی زبان کی خدمت کر سکتے ہیں اگر اُردو رسم الخط اور اُردو زبان کو اس سے خارج کر دیا جائے؟ میں ہمیشہ تو تمہارے پاس رہوں گا نہیں مگر تم میرے رخصت ہو جانے کے بعد میرے الفاظ کو یاد کرو گے...... عدم رواداری مذہب کی نفی ہے۔''(۱۱)

اُردو اور ہندی کے مرکب 'ہندوستانی' کی قبولیت اور مقبولیت کے لیے کوشش کرتے ہوئے گاندھی جی تو راہِ عدم پر چل دیے لیکن وجود میں آنے والی نئی ریاستوں نے قومیت کی نئی تعریفوں میں زبانوں کو بنیادی حیثیت دی۔ ہندوستان میں ناگری خط میں لکھے جانے والی 'ہندی' قومی زبان ٹھہری اور پاکستان میں اُردو اپنے رسم الخط کے ساتھ ریاست کی قومی زبان قرار دی گئی۔ ہمارے یہاں اُردو کی اس حیثیت نے مستقبل کی سیاست پر نہایت گہرے اثرات مرتب کیے اور ایک نقطۂ نظر کے مطابق ملک کی دو حصوں میں تقسیم کے دوسرے بہت سے محرکات میں سے ایک قومی زبان بھی تھی۔ ہندوستان میں سنسکرت آمیز ہندی صرف ریاستی اداروں کے کاغذات یا رجعت پسند عناصر کا ہتھیار بن کر آج تک زندہ ہے ۔عوامی زبان آج بھی گاندھی جی کی وہی 'ہندوستانی' ہے جس میں اُردو اور ہندی دونوں کے الفاظ موجود ہیں۔ اُردو والے اسے ہندوستانی کے بجائے 'اُردو' کہہ کر خوش ہوتے ہیں اور 'ہندی' والے ہندی کہہ کر۔ حقیقت میں ہندوستان کی لنگوا فرانکا دونوں کے مشترک ذخیرۂ الفاظ پر مشتمل ایک ایسی زبان ہے جس نے کھڑی بولی سے ارتقا پایا، کبھی ہندوستانی کہلائی تو کبھی ہندی اور اُردو۔ ہندوستان میں عام طور پر اسے ناگری خط میں لکھا جاتا ہے۔ شیخ سلیم احمد نے 'گھر جو تقسیم ہو گیا' کے پیش لفظ میں موجودہ حقیقی صورتحال کا نقشہ کھینچتے ہوئے لکھا ہے:

''تاریخ کا عمل از خود اپنا کام کرتا ہے جس پر کسی کا کوئی اختیار نہیں ۔مسلمانوں کی پہلی ہی ہزیمت سے ہندی کے ساتھ دیو ناگری رسم الخط کی بالا دستی قائم ہو گئی۔ اس کے بعد

> اُردوکوآج تک ایوان اقتدار میں بازیابی حاصل نہیں ہوسکی۔آج ناگری کا چلن بڑھ رہا ہے، مسلمانوں کے مذہبی لٹریچر کا بڑا حصہ ناگری میں منتقل ہو چکا ہے۔اُردوادب، تاریخ وتہذیب کی بہت سی کتابیں ناگری میں دستیاب ہیں۔جدید اور کلاسیکی شعرا کا کلام ناگری لپی میں منظرِ عام پر آرہا ہے۔ہندی کے بہت سے ادیب و دانشور اردو کلاسیکی ادب، میر اور غالب پر اُردو کے اہل زبان سے زیادہ اچھی گفتگو کرنے کے اہل ہیں۔مسجدوں میں نمازوں کے نظام الاوقات، شادی بیاہ کے دعوت نامے ہندی میں چھپنے لگے ہیں۔ہماری روزمرہ کی بات چیت میں ہندی کے الفاظ بے ساختہ نکلتے ہیں۔ہماری نسلیں ہندی بولتی ہیں۔دوسری طرف یہ کھیل کھیلا جارہا ہے کہ ہندی کے اخباروں، رسالوں، الیکٹرانک میڈیا اور فلموں میں اُردو زبان اور شاعری خوب استعمال ہورہی ہے۔بول چال کی زبان میں تو فرق ہی نہیں سب ہندی کے کھاتے میں جارہا ہے۔اُردو پر ہندی کی مہر لگ رہی ہے۔میری عمر کے اُردو دان تو یہ دیکھ کر خوش ہوتے ہیں، سوچتے ہیں اُردو ترقی کر رہی ہے، مقبول عام ہورہی ہے۔بات ٹھیک بھی ہے مگر ہماری دوسری، تیسری نسلیں تو یہی کہیں گی کہ یہ ہندی ہے۔اس وقت اُردو ایک شیلی بھی نہیں رہ جائے گی۔ہندی اُردو کو اپنے دامن میں سمیٹ لے گی۔
> نقصان کیا ہورہا ہے، یہی نا کہ اُردو نام مٹا دیا، زبان تو زندہ ہے، ناگری رسم الخط میں ہی سہی......'اُردو بچاؤ' کی لنگڑی لولی جیسی بھی لڑائی ہم نے پچھلے سو سال میں لڑی ہے، اسے کامیابی نہیں ملی۔بلکہ حالات بد سے بدتر ہوتے گئے۔یہ تاریخ کا دھارا ہے، ندی کی طرح بہتا ہے۔اسے پیچھے کی طرف نہیں دھکیل سکتے۔"(۱۲)

تاریخ کے اس دھارے نے ہندوستان میں تو بڑی حد تک اُردو اور ہندی کو ایک ہی دائرۂ عمل میں جوڑ دیا جو بالآخر ہونا تھا لیکن آزادی کے بعد پاکستان میں اردو زبان نے ارتقا کی مختلف منازل طے کیں۔یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس ارتقا میں عربی، فارسی اور انگریزی کے غیر معمولی اثرات بھی اس نے قبول کیے اور بہت سی مقامی زبانوں کے اثرات بھی۔آج عام بول چال کی اُردو یقیناً سو برس پہلے کی اردو سے مختلف ہے۔یہی صورتحال ہندی کی ہے۔بول چال کی ہندی بھی اتنی عام فہم نہیں رہی جتنی سو برس پہلے کے ہندوستان میں تھی۔لیکن اس ارتقا سے دونوں زبانوں میں پیدا ہونے والی معمولی سی اجنبیت کے باوجود سرحد کے دونوں اطراف کے لوگ ایک دوسرے کی بات با آسانی سمجھتے ہیں اور یہ نکتہ اس حقیقت کا اظہار ہے کہ ایک ہی ملک کی دو زبانیں سرحدیں کھنچنے کے باوجود ایک دوسرے سے اتنی ہی گہری قربت رکھتی ہیں جتنی دونوں اطراف کے لوگوں کے باطن میں موجود ہے۔اُس نسل کے لوگ یقیناً بہت کم رِہ گئے ہیں جنھوں نے تقسیم کا پورا عمل اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اپنے دِل پر سہا لیکن یہ بات نہایت خوش آئند

ہے کہ اُن کے بعد کی نسل نے اپنے اسلاف کے جذبات اپنی روحوں میں سموئے۔ شناخت کے کچھ نئے زاویے موجودہ یا آنے والی نسلوں سے جڑی اُمیدیں مجروح کرنے کی کوشش کر سکتے ہیں لیکن اب سائنس اور ٹیکنالوجی کی بے پناہ ترقی اُن کے آڑے آئی گی۔ دیکھنا یہ ہے کہ سرحد کے دونوں اطراف کی نئی نسلیں متذکرہ نئے زاویوں کا اثر قبول کر کے فخر محسوس کرتی ہیں یا اُس وحدت کو سچ مانتی ہیں جس کی اساس ہماری دھرتی کے صدیوں کے ارتقا پر ہے۔

حوالہ جات وحواشی

۱۔ پریم چند، منشی، ''اُردو میں فرعونیت''، مشمولہ: اُردو زبان اور اُردو رسم الخط' لسانی تعبیر اور روحانی تفسیر، ترتیب وتدوین: پروفیسر فتح محمد ملک، مقتدرہ قومی زبان پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۰۸ء، ص۱۱۶۔۱۱۷

۲،۳،۴۔ بحوالہ: ذاتوں کی زبانوں کا ارتقا اور اُردو، از: رام ولاس شرما، مشمولہ: اُردو' ہندی دانشوروں کی نظر میں، مرتبہ: ڈاکٹر سید حامد حسین، انجمن ترقی اُردو (ہند)، نئی دہلی، ۱۹۸۳ء، ص۱۰۰

5. IN: The Politics of Language, Urdu/Hindi: An Artificial Divide, African Heritage, Mesopotamian Roots, Indian Culture & British Colonialism, by Abdul Jamil Khan, Algora Publishing, New York, 2006, P.247

۶۔ عبدالحق، مولوی، ''تقریر''، مشمولہ: ہندوستانی زبان، ترتیب وتعارف: محمد قاسم نوری، درد اکادمی، لاہور، ۱۹۶۹ء، بار دوم، ص۷۸

۷۔ روئداد (جلسہ مسلمانانِ علی گڑھ ودیگر اضلاع جوناگری حروف کے عدالتوں میں جاری ہونے پر غور کے لیے ۱۳ مئی ۱۹۰۰ء روز یک شنبہ کو کراستوریٹ ہال علی گڑھ میں منعقد ہوا، مطبع مفید عام، آگرہ، ۱۹۰۰ء، ص۱۰۔۱۲

۸۔ بحوالہ: ہندی اُردو قضیہ کا تاریخی پس منظر، از ڈاکٹر رفیق زکریا، مشمولہ: گھر جو تقسیم ہوگیا، مرتبہ: شیخ سلیم احمد، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۷ء، ص۱۹۴۔۱۹۵

۹۔ مسعود حسین خاں، ''اُردو زبان: تاریخ، تشکیل، تقدیر''، مشمولہ: گھر جو تقسیم ہوگیا، ص۵۴۔۵۵

۱۰۔ مشترکہ زبان: مہاتما جی نے کیا سوچا تھا، (مرتبہ)، انجمن ترقی اُردو (ہند) علی گڑھ، ۱۹۴۷ء، ص۱۸۸

۱۱۔ ایضاً، ص۲۰۴۔۲۰۵

۱۲۔ سلیم احمد، شیخ، (پیش لفظ) ''گھر جو تقسیم ہوگیا''، (مرتبہ)، ص۱۴۔۱۵